تبصرۂ کتب

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

ANSWER TO THE MODERNISM ترجمہ

الانتباهات المفيده عن الاشتباهات الجديده

مصنف : مولانا اشرف علی تھانوی۔

مترجمین : محمد حسن عسکری اور کرار حسین۔

ناشر : مکتبہ دارالعلوم، کراچی۔

سن طباعت : ۱۹۷۶ء ضخامت : ۱۲۰ صفحات۔

طباعت : عمدہ قیمت : درج نہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ہی یورپ کے بعض مذہبی تضادات بھی اسلامی دنیا میں داخل ہوئے ان میں سے ایک "سائنس اور مذہب کے تصادم" کا نظریہ تھا۔ حقیقتاً یہ نظریہ زمانۂ وسطیٰ میں یورپ کے مخصوص مذہبی تضادات کا آئینہ دار تھا جس میں کلیسا نے بہت سی ایسی چیزوں کو مذہبی عقائد کا درجہ دے دیا تھا جن کا اصلاً مذہب سے تعلق نہ تھا۔ برصغیر میں یہ کشمکش علی گڈھ کالج میں پیش آئی جو یہاں نئی تعلیم کی مرکزی علامت کے طور پر ابھرا تھا۔ نئی نسل جو اپنے روایتی ورثہ سے بہت کم آشنا تھی نئے نصابِ تعلیم کے ذریعے ان تضادات کا شکار ہو گئی۔ ان کی رہنمائی کے لئے نصابِ تعلیم سے باہر کی راہیں واضح نہیں تھیں۔ ایک طرف اعتذار پسند "اسلامی" ادب تھا جو بنیادی طور پر مغربی تمدن کی اقدار کو تسلیم کر کے آگے چلتا تھا، دوسری طرف خالص مذہبی ادب تھا جو قرونِ وسطیٰ کے طرزِ فکر اور طرزِ استدلال کی ترجمانی کر رہا تھا۔

علی گڈھ کے ارباب دانش کو اس امر کا شدت سے احساس تھا اس ضمن میں انھوں نے علماء سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ انہی میں ایک کوشش کتاب "الانتباہات المفیدہ" کی صورت میں منتج ہوئی۔

زیر تبصرہ کتاب مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ان مواعظ کا انگریزی ترجمہ ہے جو انہوں نے علی گڈھ کے طلبہ کو دیئے تھے۔ کتاب کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر کو سامنے رکھنا چاہیئے کہ مولانا تھانوی کے چھوٹے بھائی علی گڈھ میں سب انسپکٹر تھے۔ ۱۳۲۷ھ میں بنگال جاتے ہوئے مولانا بھائی سے ملنے کے لئے علی گڈھ رُکے۔ علی گڈھ کالج کے طلبہ نے نواب وقار الملک کے توسط سے مولانا سے وعظ کی درخواست کی، مولانا نے محسوس کیا کہ کالج کے طلبہ میں تلاشِ حق کا جذبہ موجود ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی اصلاح کے لئے مواعظ سننا چاہتے تھے (ص ۴)۔ یہی مواعظ بعد میں کتاب کی صورت میں غالباً ۱۳۳۰ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئے۔ کتاب کے متعدد ایڈیشن مختلف ناموں سے چھپتے رہے۔ ان پر حواشی بھی لکھے گئے۔ جن میں سے مولانا تھانوی کے خلیفہ جناب محمد مصطفیٰ کی شرح "حل الانتباہات" ۱۳۷۱ھ میں "اسلام اور عقلیات" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

دیباچے میں "علم کلام جدید کی تدوین کی ضرورت" کی تردید کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ قدیم علم کلام ہر عہد کے شکوک شبہ کے ازالہ کے لئے کافی ہے۔ دیباچے میں اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ نئی نسل شبہات کا شکار اس لئے ہے کہ اس میں اتباع کی عادت کم ہے اور علماء سے رجوع کرنے کی بجائے اپنی فہم و رائے پر اعتماد کرتی ہے۔ اس کے بعد علوم کی تقسیم بیان کرتے ہوئے شریعت سے ان کے تعلق کی وضاحت کی گئی ہے دیباچے کے بعد استدلال سے متعلق سات بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے مادہ، وجود باری تعالیٰ، بھوت، فرشتے، حیات بعد الموت وغیرہ مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

بظاہر یہ کتاب ایسے لوگوں کے لئے لکھی گئی تھی جو اسلامی علوم سے واقفیت نہیں رکھتے تھے لیکن کتاب کے اسلوب استدلال اور زبان پر عربی زبان کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے کتاب بالکل ناقابل فہم بن گئی تھی۔ کتاب خود اردو میں ترجمے کی متقاضی تھی، اسی لئے اس کی شرحوں کی ضرورت پیش آئی۔ طرز استدلال بھی ایسا ہے جس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے دینی علوم میں تعلیم پائی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کتاب کے انگریزی میں ترجمے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا آج بھی وہ شبہات باقی ہیں جن کے ازالہ کے لئے یہ کتاب ستر سال پہلے لکھی گئی تھی؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے

فاضل مترجمین کے نزدیک یہ کتاب ایک تاریخی اور اہم دستاویز ہے۔ شروع میں مولانا موصوف کو بجا طور پر اس سلسلۂ ذہب میں شمار کیا گیا ہے جن کی برکت سے سترہویں صدی کے بعد اسلام کا مرکز جنوبی ایشیا میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے کی ابتداء حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ہوتی ہے اور مولانا اشرف علی تھانویؒ اس سلسلے کی نہایت اہم کڑی ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کی فکری اور سیاسی تحریکوں پر مولانا تھانوی کے اثرات بہت وسیع اور گہرے ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ برصغیر میں جہاں بھی کسی تحریک میں روایت سے بغاوت کے رجحانات سر اٹھاتے رہے تھے، انہیں مولانا تھانوی کے اثرات کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ اس سلسلے میں مولانا دریابادی، مولانا سلیمان ندوی اور دیگر شخصیات کے نام لئے جا سکتے ہیں جن کے مولانا کے زیر اثر آنے سے ندوہ، جمعیۃ العلماء اور دوسری تحریکیں ایک اہم موڑ پر پہنچیں۔ یہ پہلو اتنا اہم ہے کہ اس پر تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔ فاضل مترجمین کے نزدیک زیر تبصرہ کتاب "ان "متجددین" کے جواب کے طور پر لکھی گئی ہے جو انیسویں صدی میں سائنس پرستی" اور مغربی استعمار کی مادی طاقت سے مرعوب ہو کر اسلامی عقائد کے بارے میں ہر قسم کے بے بنیاد شبہات اور غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے تھے اور "نئے" یا "متجددانہ اعتذار" کے لئے شور مچا رہے تھے خواہ اس میں صحت و صداقت بھی ہاتھ سے جاتی رہے۔" (ابتدائیہ)

چونکہ فاضل مترجمین نے کتاب کو اسی زاویہ سے دیکھا ہے اس لئے شاید اس کا نام "جواب تجدد" رکھا۔ لیکن یہ "عنوان" کتاب کے اصل عنوان اور مقصد سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ہمارے خیال میں کتاب کے مخاطب وہ لوگ تھے جو بنیادی طور پر قدامت پسند تھے لیکن شبہات کی وجہ سے اضطراب کا شکار تھے۔ اور ایسے دلائل کے منتظر تھے جو ان شبہات کو دور کر کے ان کے بنیادی موقف کو مضبوط بنا سکیں۔

ترجمہ نہایت رواں اور سلیس ہے اصطلاحات کے ترجمے بہت کامیاب ہیں۔

علمی حلقوں میں فاضل مترجمین کسی تعارف کے محتاج نہیں، اس لئے ان سے بجا طور پر امید تھی کہ وہ اس کتاب کے شروع میں، جسے وہ ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے۔ ایک مبسوط مقدمہ لکھیں گے تاکہ کتاب کے پس منظر، اور اس وقت کے فکری رجحانات کا پتہ چلتا۔ اب تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ ترجمہ کس ایڈیشن کا ہے۔ مصنف سے متعلق نوٹ بھی نہایت سرسری ہے۔ حواشی سرے ہی سے نہیں۔ حالانکہ بیشتر جگہ ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً جب کہ مخاطب ایسے لوگ ہوں جو قدیم یونانی منطق کی طرز استدلال اور اصطلاحات سے واقف نہیں ہیں۔ عربی الفاظ کے انگریزی املا میں

صحت کا التزام قطعاً نہیں رکھا گیا، جب کہ اس سلسلے میں رہنمائی کے لئے بین الاقوامی طور پر مسلّمہ قواعد موجود ہیں۔

ترجمہ سے ایک عام تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترجمہ پرانے ترجمہ کیا گیا ہے، کتاب اور اس کے مندرجات کو معیاری انداز سے پیش کرنے کی قطعی کوشش نہیں کی گئی۔ نہ ہی اس سلسلے میں کسی قسم کی تحقیق و تصدیق کو ضروری سمجھا گیا، مثلاً اصل کتاب (ص ۲۰) میں علی گڈھ کالج کے سیکریٹری کو نواب وقار الامرا کے نام سے ذکر کیا گیا تھا۔ ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور وقار الامرا ہی لکھ دیا گیا۔ (ص ۴)

(محمد خالد مسعود)